Volume 02, Issue 01 جنوری تا جون 2021

تحقیقی مجلہ تحقید، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

eISSN:2789-6331
pISSN:2789-4169

عبداللہ حسین کے نادار لوگ: ایک نو تاریخی مطالعہ

A New Historical study of Abdullah Hussain's Novel Nadar Log

حنا جمشید / پی ایچ ڈی سکالر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

ڈاکٹر شازیہ عنبرین / اسسٹنٹ پروفیسر، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

Hina Jamshed, PhD Scholar, BZU Multan

Dr. Shazia Anbreen, Asst. Prof. BZU Multan

Abstract:

New Historicism is a new literary study that is based on the relationship between literature, culture and history. This postmodern literary study depicts how to read analysis and understand the intellectual history through literature. New Historicism claims that literature should be studied and interpreted within the context of both the history of the author and the history of the critic. This essay is presenting a new historic study of Abdullah Husain's novel 'Nadar Log'. As we know that Nadar Log is a tragedy of Pakistan after partition, here Abdullah Husain streams the political and historical events such as East Pakistan tragedy and the beyond political circumstances. Through a clear political wisdom Abdullah Husain bravely presents unbiased picture of collective corruption, injustice, tyranny, ignorance, exploitation and political intrigue of power structure. This essay is an intellectual, cultural and new historical study of the literary text of 'Nadar Log' in the context of after partition issues of Pakistan's history.

Key Words: *New Historicism, Literary Criticism, Historicism, Ideology, Narrative, cultural materialism.*

کلیدی الفاظ: نو تاریخیت، ادبی تنقید، تاریخیت، بیانیہ، مقتدر نظریات، ثقافتی مطالعات

تاریخ، ثقافت اور ادب کی تثلیث کے باہم مربوط ہونے اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ ماضی میں گزرے واقعات کے ساتھ ساتھ، اُن واقعات کے بیان کا ایسا مجموعہ بھی ہوتی ہے، جسے علت اور معلول کے مختلف بیانیاتی رنگوں میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ بیان کے یہ انداز تاریخ کے تصور کو، مقتدر قوتوں کی اجارہ داری اور تسلط کا وہ جواز فراہم کرتے ہیں جس کی بنیاد پر ماضی کی استعماری قوتیں، طاقت اور اقتدار پر اپنی گرفت مستحکم کرتی ہیں۔ تاریخ کا یہ تصور ماضی میں رونما ہونے والے واقعات پر ہی نہیں بلکہ ان کے اسباب و محرکات، مخصوص بیانات اور دستیاب حقائق پر بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ نت نئے سوال اٹھاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخ، تاریخیت اور نو تاریخیت کے پیچیدہ مباحث نے ادبی تصورات، تاریخی حقائق اور ثقافتی اقتدار کو متشکل کرنے والے رجحانات کے وجود پر سوال اٹھایا ہے۔ ادب، تاریخ اور ثقافت کا رشتہ جس کے باہمی تفاعلات پر ابتداء میں کئی سوال اٹھائے جاتے تھے، اب مابعد جدید تصورات کے تحت زیادہ مضبوط اور منظم صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ امریکہ میں ساٹھ کی دہائی کے بعد جب جدیدیت اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہی تھی، تب تاریخیت پسندوں اور ہیئت پسندوں کے مابین کم ہونے والے فاصلوں نے ادب اور فن کے شعبوں میں ساختیات اور پس ساختیات کے زیر اثر نو تاریخیت کے نئے تنقیدی مباحث کی داغ بیل ڈالی۔ ان مباحث نے ادبی و تاریخی متون کی کثیر المعنوی جہات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، تاریخی حقائق کی دریافت اور ان کے استناد کا وہ سلسلہ شروع کیا جس نے تاریخ کے جامد اور متعین تصور کو یکسر بدل ڈالا۔

تاریخیت سے نو تاریخیت تک کا سفر در حقیقت اپنے اپنے دائرہ کار میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ تاریخ جسے عہدِ رفتہ میں گزرے حالات و واقعات کا نام دیا جاتا ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخیت کے تصور سے اس لیے مختلف ہے کہ تاریخیت در حقیقت تاریخ کے واقعات کو مختلف بیانات کے ذریعے نہ صرف آگے پہنچانے بلکہ ان واقعات کے بیانات کو ان مخصوص تاریخی بیانیوں کی سرپرستی میں دیکھنے، پرکھنے اور آگے ترسیل کرنے کا بھی نام ہے جسے گزرے وقت کے مقتدر طبقات نے اپنے مفادات کی خاطر متشکل کیا۔ جب کہ نو تاریخیت تاریخ کو محض ایک بیاناتی متن قرار دیتے ہوئے مختلف ادبی متون کی مدد سے تاریخ کے ان اقعات اور مختلف و متضاد بیانات کو اپنی مطالعاتی حکمت عملیوں سے سمجھنے کا نام ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو نو تاریخیت اپنے اندر ایک وسیع، سیاسی، سماجی اور ثقافتی مفہوم کی متحمل معلوم ہوتی ہے۔

ساٹھ کی دہائی میں امریکہ میں نو تاریخیت کے مباحث کا آغاز اسٹیفن گرین بلاٹ کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ گرین بلاٹ اور اس کے رفقاء نے مختلف تحقیقی اور تنقیدی مضامین سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ادبی متن اپنی بنت میں ایک مکمل نامیاتی کُل ہوتا ہے، جس کی اساس بنیادی طور پر اس کی اپنی ثقافتی شعریات پر ہی استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی ادبی متن کی تفہیم تبھی مکمل ہو سکتی ہے جب اس سے متعلقہ عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور ثقافتی معاملات سے مکمل آگہی ہو۔ وہ ان تمام عوامل کو متن اساس قرار دیتے ہوئے ادبی متون کو مخصوص ثقافتی، سیاسی و تاریخی تناظرات میں سمجھنے کی بات کرتا ہے۔ بقول گرین بلاٹ:

> "But it must be supplemented by an understanding that the work of art is not itself a pure flame that lies at the source of our speculations, rather the work of art is itself the product of a set of manipulations." (1)

گرین بلاٹ اور اس کے رفقاء نے ادبی متون کو براہِ راست ثقافتی و تہذیبی ظواہر کا عکس نہ مانتے ہوئے بھی ان پر اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی عناصر کے اثرات کا ذکر کیا۔ وہ ادب میں ان مستور، متخالف اور پیچیدہ رویوں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے نہ صرف ادب کی داخلی خود مختاری اور مطلق آزادی کو سلب کیا بلکہ انھیں ایک مخصوص سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں متشکل کیا۔ یوں علت اور معلول کے اس مخمصے نے ادبی متون کو ان کے تاریخی تناظرات کے ساتھ، مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر ا مخصوص نو تاریخی مطالعے سے پرکھنا شروع کر دیا اور تاریخ کو ایسا متن قرار دیا جسے مخصوص و مقتدر طبقات کے متعین کیے گئے مقتدر بیانیوں پر استوار کیا گیا تھا۔

اسٹیفن گرین بلاٹ نے اپنے ادبی و تحقیقی مضامین میں ادب اور تاریخ کے مابین راست تعلق پر بات کرتے ہوئے ادبی متون کی خود مختاری اور دیگر سیاسی، سماجی و ثقافتی اثرات سے ان کے مبرا ہونے پر نہ صرف اعتراض کیا بلکہ تاریخ کے ان مقتدر بیانیوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی، جنھیں طاقتور طبقات نے سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی ظواہر میں اپنے مفادات یا طاقت و اقتدار کے حصول کے لیے ایک خاص قسم کی ذہن سازی سے استعمال کیا۔ یہی نہیں بلکہ اسٹیفن گرین بلاٹ نے مختلف ادبی و تاریخی متون کے متصل

مطالعے اور تجزیے سے نو تاریخی و ثقافتی مطالعہ جات کی وہ بنیاد ڈالی جس نے تاریخ کے مقتدر بیانیوں پر گرفت کرتے ہوئے، مستور اور پوشیدہ حقائق کی بازیافت کے ایک نئے سلسلے کو شروع کیا۔

بقول اسٹیفن گرین بلاٹ:

"It is imperative that we acknowledge the modification and find a way to measure its degree, for it is only in such measurements that we can hope to chart the relationship between art and society. Such an admonition is important methodological self-consciousness is one of the distinguishing marks of the new historicism in cultural studies as opposed to a historicism based upon faith in the transparency of signs and interpretative procedures__ but it must be supplemented by an understanding that the work of art is not itself a pure flame that lies at the source of our speculations." (1)

نو تاریخیت کے مباحث نے ادبی متون کو ثقافتی ظواہر کا نقش ثابت کرنے کے باوجود، تاریخ اور ثقافت کے مابین راست تعلق کے وجود سے گریز کیا۔ درحقیقت نو تاریخیت ادبی متون کی تہہ میں ملفوف تاریخی حقائق کی دریافت کا نام ہے۔ گویا تاریخ میں واقعاتی شکل میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوا، ان واقعات کی بعد میں بیاناتی شکل میں آگے کی جانب ترسیل کے عمل میں، شعوری طور پر ان نظریات و تصورات کا ہاتھ زیادہ تھا جو مختلف مؤرخین کے اپنے ذاتی افکار و نظریات یا اس عہد کے مقتدر طبقات کے وضع کیے گئے اصولوں سے میل کھاتا تھا۔ نو تاریخیت ایسے تاریخی مواد کی صحت پر نہ صرف سوال اٹھاتی ہے، بلکہ تاریخی متون کی تحقیق اور تجزیے کے لیے اپنی بنیاد ان ادبی متون پر رکھتی ہے، جن میں تاریخ کے ان واقعات کا بیان بین السطور موجود ہو۔ گویا تاریخ کے نام پر واقعات کی شکل میں جو کچھ اگلی نسلوں کو منتقل کیا گیا، اس تاریخی مواد کے استناد کو جاننے کے لیے شواہد کا حصول، تاریخ کو محض ایک متن گردانتے ہوئے اس متن پر اٹھائے گئے سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کے عمل میں مضمر ہے، جو مختلف ادبی متون کے نو تاریخی مطالعے کا سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظرات میں مطالعہ کر کے ہمیں کسی عہد کی عصری تاریخ کے مستند حقائق تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔

برطانیہ میں نو تاریخیت کے مباحث کا آغاز ریمنڈ ولیمز کے ثقافتی مادیت کے تنقیدی مباحث سے ہوتا ہے۔ ایک مارکسی نقاد ہونے کے باوجود ریمنڈ ولیمز کے کئی مباحث نو تاریخیت کے بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب Mrxism and Literature 1977

میں ثقافتی مادیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے نئی مارکسی ثقافتی تھیوری وضع کی۔ ریمنڈ ولیمز نے اپنے دوستوں کے ہمراہ اپنے کئی ادبی مباحث میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی، کہ تمام تاریخی ادوار میں پیش آنے والے واقعات، اپنی اصل حیثیت میں غیر مربوط اور تضادات سے پر ہوتے ہیں۔ وہ ان واقعات کی بنیاد ایسے مخصوص بیانیوں پر استوار قرار دیتا ہے، جنھیں مقتدر طبقات اپنی مرضی و منشاء سے، مختلف مؤرخین کے ذریعے، محض اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے وضع کرتے ہیں اور سماج میں اپنی طاقت کے بل پر رائج کرتے ہیں۔ بقول ریمنڈ ولیمز:

"We cannot separate literature and art from other kinds of social practice, in such a way as to make them subject to quite special and distinct laws." (2)

دیکھا جائے تو اس سے قبل تاریخیت کے مکتبِ فکر پر مارکس کی گہری فکر اور اثرات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے اس تصور میں کسی بھی ادبی متن کی تفہیم کے لیے اس کے سیاسی و سماجی تناظرات کے ساتھ ساتھ، اس کی تشکیل میں معاون عوامل کے اثرات و نتائج کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ جب کہ نو تاریخیت تاریخ کا جائزہ کسی بھی ریاست کے ان مقتدر طبقات کی طاقت کے زیر اثر لیتی ہے، جو طاقت کے منابع سے، اپنے مفاد و اقتدار کی خاطر نت نئے بیانیوں کو جنم دیتے ہیں اور انھیں ایک غیر محسوس انداز میں سماج میں کچھ اس

طریقے سے رائج کرتے ہیں کہ اس معاشرے میں رہنے والے مظلوم عوام کو کبھی اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ مقتدر قوتوں کے متشکل کیے گئے بیانیوں کے تحت، اُن کی مرضی سے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ذہن سازی کا وہ مخصوص طریقہ کار ہوتا ہے جس کی تشکیل مقتدر قوتیں بااثر اداروں، تعلیمی نصابوں اور مذہبی و قانونی ذرائع کے ذریعے سے احسن طریقے سے سرانجام دیتی ہیں۔

نوتاریخیت کی بنیادی فکر میں، طاقت اور مقتدر طبقات کے تاریخ، تہذیب اور سماج پر اثرات کا مطالعہ کرنے کے حوالے سے، سب اہم اور نمایاں نام مشل فوکو کا ہے۔ مشل فوکو نے نوتاریخیت کی بنیاد میں کارفرما ساختیاتی فکر کو، تاریخ اور ثقافت کے ساتھ نہ صرف ہم آہنگ کیا بلکہ ساختیات کی بنیادی فکر میں موجود، لسانی اظہارات سے منسلک عناصر مثلاً ادب اور فن وغیرہ، جن کا براہِ راست تعلق تاریخ اور ثقافت سے جاملتا ہے، فوکو نے ان اظہارات کی بنیاد میں موجود اس مقتدر بیانیے کا ذکر کیا، جو منشائے مصنف پر شعوری یا لاشعوری سطح پر ضرور اثرانداز ہوتا ہے، فوکو کے نزدیک مقتدر عصری بیانیوں کے جبر کا اظہار، یا ان کے خلاف مزاحمت بھی ہمیں اسی طرح ادب یا فن میں مستور لیکن موجود دکھائی دیتی ہے۔ بقول فوکو:

> "Lastly, in no way do they authorize us to speak of a structuralism of history, or at least of an attempt to overcome a 'conflict' or 'opposition' between structure and historical development: it is long time now since historicians uncovered, described and analysed structures, without ever having occasion to wonder whether they were not allowing the living, fragile, pulsating 'history' to slip though their fingers."(3)

نوتاریخیت تاریخ کو ایک متن قرار دیتے ہوئے اس کے بیانات کو ایسا بیانیہ قرار دیتی ہے جس پر مقتدر قوتوں کے گہرے اور گھمبیر اثرات موجود ہوں۔ اسی لیے نوتاریخت تاریخ کو ایک متن سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی اور اس کی تشکیل میں ان تمام مقتدر قوتوں اور ان کے متشکل بیانیوں کا بغور جائزہ لیتی ہے، جو تاریخ کے اصل حقائق کو اپنے مخصوص عقائد و نظریات کے تحت غائب یا نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس تفہیم کے لیے وہ تاریخی متون کے ساتھ ساتھ ان ادبی متون کے مطالعے کو بھی اہمیت دیتی ہے، جو اپنے متن میں تاریخ کے گمنام حقائق کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ نوتاریخیت ان ادبی و تاریخی متون کے متصل مطالعے سے، ان متون کے پیش منظر یا پس منظر میں موجود حالات واقعات سے، تاریخ کے اصل حقائق تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرتی ہے۔ نوتاریخیت کے نزدیک ایک ہی زمانے سے منسلک ادبی و تاریخی متون یکساں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک ادبی متن اور ایک غیر ادبی متن دونوں تاریخ کے درست سیاق و سباق کی تفہیم میں معاونت کرتے ہیں۔

نوتاریخیت پر فوکو اور دریدا کے تصورات اور نظریات کی گہری چھاپ کے سبب طاقت کے سماجی ساختوں اور مقتدر بیانیوں کی تفہیم نہایت آسان ہو جاتی ہے۔ اشرافیہ اور مقتدر قوتوں کی طاقت کے یہی سماجی ساختیے، سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی سطح پر ان مقتدر بیانیوں کو متشکل کرتے ہیں، جو طاقت کی عملی تشکیل کے لیے عوام کی ایک خاص قسم کی ذہن سازی کرتے ہیں اور اس متعلقہ عہد کی تاریخ کو مختلف مذہبی اور سیاسی تصورات و نظریات کے متعصب بیانیوں کے زیرِ اثر وضع کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیر:

> "نئی تاریخیت کا، تاریخی عمل کی علامتی جہات اور علامتی عمل کی تاریخی جہات میں دلچسپی لینے کا مطب یہ ہے کہ تاریخ کا مفہوم اکہرا نہیں۔ تاریخ جتنی ظاہر ہے اتنی غیاب میں بھی ہے۔ یا تاریخ جس قدر گویا ہوتی ہے اسی قدر خاموش ہوتی ہے۔ تاریخ کے اسی غیاب اور خاموشی، کی وجہ سے تاریخ میں خلاء، شگاف، درزیں اور عدم تسلسل ہے۔۔ ادب بھی علامتی عمل ہے جو اس مکتب کی رو سے تاریخ سے الگ نہیں۔۔ یعنی تاریخ واقعہ نہیں ایک ڈسکورس ہے اور ہر ڈسکورس میں ادبی متن کی طرح عدم قطعیت ہوتی ہے۔"(4)

گویا تاریخ میں حاشیے سے باہر تاریخ کے حقائق عموماً ان حقائق سے مختلف ہوتے ہیں جو ایک مخصوص بیانیے کے زیر اثر بیان کیے جاتے ہیں یا پھر اس توقع سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں جنھیں مؤرخین نے مخصوص نظریاتی رویوں یا طاقت کی منشاء کے مطابق دانستہ نظر انداز کیا ہوتا ہے۔ ایسے میں ایک ادیب اپنی تخلیقی صلاحیت کو استعمال میں لاتے ہوئے نہ صرف اپنے زمانے کا سچ، اپنی تخلیق میں رقم کرتا ہے بلکہ بسا اوقات یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سچ یا مزاحمت کے نتائج اس کے لیے کتنے دردانگیز ہوں گے، وہ اپنے تخلیقی متن میں تاریخ کو یوں مختلف کرداروں، حالات، واقعات اور کہانی کے بیان کے ذریعے ملفوف انداز میں پیش کرتا ہے کہ تاریخ کے کئی حقائق اس متن میں ملفوف و پوشیدہ انداز میں مستور ہو جاتے ہیں۔ یہ عصری حقائق تبھی سامنے آتے ہیں جب کوئی نو تاریخی نقاد ان تخلیقی متون کا مطالعہ اپنی تحقیق، تجزیے اور علمی بصیرت کی بنیاد پر کرتا ہے۔۔

پاکستان اپنے قیام کی ابتداء سے ہی دیگر کئی مشکلات و مسائل کے ساتھ ساتھ مقتدر قوتوں کے اس جبر کا شکار بھی رہا ہے، جس نے اس نوزائیدہ مملکت کو کسی مالِ غنیمت کی مانند سمجھا۔ پاکستان کی تہتر سالہ تاریخ کے نشیب و فراز میں ایسے کئی حالات، واقعات اور سانحات موجود ہیں جن کے مکمل عصری و تاریخی حقائق کو، نہ تو مقتدر قوتوں نے کبھی منظرِ عام پر آنے دیا اور نہ ہی ان واقعات و سانحات کے محرکات پر کبھی کسی مؤرخ نے جامع و مفصل روشنی ڈالی۔

ایک نوزائیدہ مملکت کی شکل میں پاکستان کو اپنے قیام کی ابتداء سے ہی کمزور سیاسی قیادتوں، غیر جمہوری قوتوں اور مقتدر اشرافیہ کے درمیان حصولِ اقتدار و طاقت کی باہمی کشاکش نے، ایسے پیچیدہ سیاسی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی معاملات کے مخمصے میں ڈالا کہ جس نے ملک کو اپنے مسائل سے نمٹنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی بجائے، کئی داخلی مشکلات، مسائل اور سازشوں میں گرفتار کر ڈالا۔ تقسیم ہند کے بعد کے المناک مسائل، ہجرت کے بعد مہاجر کیمپوں کی ابتر صورتحال، غربت، بھوک بے روزگاری جیسے مسائل کے ساتھ، مسئلہ کشمیر، مارشل لاء اور غیر جمہوری قوتوں کی اجارہ داری، 1965 میں ہندوستان کے ساتھ جنگ، سیاسی و سماجی حالات کی ابتری، ایک مارشل لاء سے دوسرے مارشل لاء کا ظہور، مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین طاقت و اقتدار کی ہوس پر سیاسی صورتحال میں پیدا ہونے والی کشیدگی، 1973 کی پاک بھارت جنگ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی، سیاسی بے قاعدگیاں، جمہوری حکومتوں کا زوال، آمریت کا تیسرا دور اور ملک میں مزید بگڑتے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات نے جہاں پاکستان کی سیاست کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا وہیں عوام سے، ان تمام حالات و واقعات کے حوالے سے، ہمیشہ تاریخ کا وہ حقیقی سچ چھپایا، کہ جس تک رسائی کی اجازت انھیں مقتدر طبقات کی جانب سے کبھی نہیں دی گئی تھی۔ پاکستان کی ادبی تاریخ میں بہت کم ایسے ادیب گزرے، جنھوں نے اپنی گہری سیاسی و سماجی بصیرت کی بدولت، اپنے تخلیقی ادبی متون کے ذریعے پاکستان کی تاریخ کو عہد بہ عہد اپنے تخلیقی متون کی تہ میں مستور کر دیا۔

پاکستان ایسی نوزائیدہ مملکتوں کے لیے ہمیشہ یہ سوال اہم رہا کہ اپنی تاریخ کیسے لکھی جائے؟ یا پھر یہ کہ اس تاریخ کو لکھنے یا کسی دستاویز کی صورت محفوظ بنانے کے لیے کن ماخذات یا مسودات کو بنیاد بنایا جائے؟ جب کہ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کے استناد کے لیے ادبی ماخذات، مقتدر طبقات کی متشکل کی گئی تاریخ کے متوازی، ایک ایسی مستند اور متبادل تاریخ تشکیل دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں، جسے دانستہ پاکستان کی تاریخ کے حاشیے سے باہر رکھا گیا۔ عبداللہ حسین کو پاکستان کی عصری تاریخ کی تفہیم میں ایک بنیاد کی سی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے ناولوں کے تخلیقی ادبی متون میں پاکستان کی عہد بہ عہد تاریخ کی منظر کشی اور مستند تاریخی حقائق کی دستیابی کے باعث، اگر عبداللہ حسین کو پاکستان کا عصری مؤرخ کہا جائے تو یقینی طور پر بے جا نہ ہو گا۔

ناول اداس نسلیں سے شہرت پانے والے عبداللہ حسین نے جہاں اپنے پہلے ناول میں ہندوستان میں برطانوی استعماریت، وہاں کی مقتدر اشرافیہ، نوابین اور جاگیردارانہ طبقات کے عام ہندوستانی طبقے پر استحصال کے المیے کو بیان کیا، وہیں فسادات، تقسیم اور ہجرت کے دردناک مناظر کی عکاسی سے ایک ایسی مملکت کے قیام کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی، جو لٹے پٹے، اجاڑ اور خستہ حال عوام پر مشتمل تھی۔ عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں کے یہی لوگ ان کے دوسرے ناول 'نادار لوگ' میں ان کا موضوع بنے۔ پاکستان کی عصری تاریخ کے حقائق کی تفہیم اور ان کے استناد تک رسائی کے حوالے سے عبداللہ حسین کا ناول 'نادار لوگ' نہایت خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر روش ندیم:

> "عبداللہ حسین نے بیسویں صدی پر محیط اپنے سماج کی دستاویز تیار کی، انھوں نے ایک طرف ایک مؤرخ ادیب کا فریضہ بھی نبھایا اور انتہائی جمالیاتی فنکاری کے ساتھ اپنے حال کو بھی رپورٹ کیا۔۔ ادب تاریخ کی ایک مائیکرو اسٹڈی ہے، اس حوالے سے عبداللہ حسین نے تاریخ کی عظیم حرکت کے تحت، عام فرد کا مطالعہ اور اس کے معروض کا گہرا تجزیہ کیا ہے۔ بطور ایک ادیب کے ہی وہ اس قابل ہوا کہ وہ ایک عام مؤرخ کے برعکس عام انسانوں کی داخلی دنیاؤں تک بھی رسائی کر

کے اسے اپنی تحریر کا حصہ بنا سکے۔۔۔ وہ عام لوگ جو زمان و مکاں کا محض ایک ضمیمہ بنے رہے، جنھیں تاریخ کی کسی دستاویز میں جگہ نہیں ملی اور نہ ہی کوئی تحریر ان کی نمائندہ بنی۔"(5)

چونکہ تاریخ کے دائرہ عمل سے گزرا ہوا زمانہ مختلف ادوار میں اپنے کثیر الجہات ادبی متون کے باعث کثیر المعنی تعبیرات سے مزین ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ادبی متن میں اپنے عہد کے وہ کثیر حقائق اور تاریخ کے ان واقعات کا استناد شامل ہو جاتا ہے جو ہمیشہ مؤرخین کی بتائی یا سنائی گئی تاریخ سے، یا تو بالکل مختلف ہوتا ہے یا پھر تاریخ کے ان برائے نام نمائندہ متون میں شامل ہی نہیں ہوتا۔ یقینی طور پر اس کی وجہ مقتدر طبقات کے کے متشکل کیے گئے مفاد پرست بیانیوں سے ان حقائق کا میل نہ کھانا ہے۔ اسی لیے جب عبداللہ حسین کے ناول نادار لوگ کا نو تاریخی مطالعہ کیا جائے تو یہ ادبی متن خود اپنے اندر تاریخ کے وہ دردناک حالات و واقعات سمیٹے ہوئے ہے جو اس خطے کے لوگوں پر نہ صرف ایک جبر کی صورت گزرے بلکہ وہ اداس نسلیں جو خوشحال زندگی اور مقتدر طبقات کی سامراجی قوتوں سے نجات کا خواب دیکھتے ہوئے، ہجرت کر کے اس دھرتی میں آ بسیں، یہاں ان کے لیے حالات کی وہی بد نصیبی ان کی منتظر ٹھہری، جس سے دامن چھڑانے کا خواب دیکھ کر انھوں نے اپنا سفر باندھا تھا۔ عبداللہ حسین کے نادار لوگ میں طاقت اور جبر کے اس غیر منصفانہ سلوک کی عکاسی متن کے پیش منظر و پس منظر دونوں میں عیاں ملتی ہے۔ وہ غریب اور مظلوم طبقات کو طاقت کے اس جبر کا شکار ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں جو ازل سے ان کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے۔

ناول کے وہ مناظر جہاں بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کو مقتدر طبقات نہ صرف اپنی خدمت پر مامور، زر خرید غلام سمجھتے ہیں بلکہ وہ ان کے ذہن پر بھی اسی طرح حکومت کرتے ہیں جیسا کہ ان کے جسم پر۔ غریب اور استحصال یافتہ طبقہ اپنے استحصال پر بھی محض اس لیے خاموش رہتا ہے کہ اس کے پاس حالات کے ان جبر سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ جب کبھی وہ اپنے حق کے لیے، یا اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اس کی زبان نہ صرف بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ اسے جبر کی اس سطح تک بھی لے جایا جاتا ہے جہاں باقی استحصال یافتہ طبقات کے لیے وہ عبرت اور دہشت کی ایک نظیر بن جائے۔

اس ناول میں عبداللہ حسین نے پاکستان کے سیاسی، سماجی و ثقافتی حالات و واقعات کی وہ تصویر پیش کی ہے جس میں مقتدر قوتیں طاقت کے توازن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں، نہ تو وہ اپنی طاقت میں کمی آنے دیتی ہیں اور نہ ہی اپنے سامنے سسکتے مظلوم و غریب عوام کو اپنے حالات بہتر کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں، کیونکہ غریب کی کسی بھی قسم کی آگہی خود ان کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ ان کی ذہن سازی کچھ ایسی بنیادوں پر کرتی ہیں اور ان کے دل میں حالات اور مقتدر قوتوں کے جبر کا ایسا خوف بٹھا دیتی ہیں کہ وہ جب بھی کسی کے کہنے پر حالات کے اس جبر کو توڑنے یا ظلم کے اس دستور کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں، تو سمجھتے ہیں کہ یہ بات ہی غلط ہے، دنیا میں انصاف نام کی کسی شے کا وجود ہی نہیں۔ جس طریق پر ان کی ذہن سازی کی جاتی وہ یہ بات سوچنے پر خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ جو جبر ان کے ساتھ ہوتا ہے وہ اسی کے لائق ہیں۔ بد قسمتی سے پاکستان کے دیہی سماج کا یہ استحصال یافتہ طبقہ، پاکستان کے ابتدائی ایام میں جن مشکل اور کربناک حالات سے گزرا، وہ آج بھی حالات کے اسی جبر اور ظالم کے اسی ظلم کا شکار ہے۔ ناول کے ایک حصے میں عبداللہ حسین بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کے حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے پاکستان کی سماجی تاریخ کا وہ نوحہ اور مقتدر قوتوں کے اثر کا وہ بیانیہ رقم کرتے ہیں جو یہاں کے باشندوں کو کبھی خوشحال نہیں ہونے دیتا۔

> "اس علاقے میں بیس تیس بھٹے ہیں، لوگوں سے ملتا رہتا ہوں۔ ان لوگوں کی زندگیاں اس طرح سے گروی کی نذر ہو چکی ہیں کہ وہ زندگیاں نہیں رہیں بلکہ ایک دستور میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ ان سے کوئی مختلف بات کرو تو سمجھتے ہیں کہ آپ دستور کے خلاف بول رہے ہیں۔۔۔ تقریریں کرنے والے لیڈر سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ کیڑے مکوڑوں سے بھی گئے گزرے لوگ ہیں، انھیں ان لوگوں میں اپنا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ یہ نوے پچانوے فیصد عیسائی لوگ ہیں، جنھیں پادری کنٹرول کرتے ہیں اور بقیہ لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"(6)

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک نوزائیدہ مملکت کے قیام کا نعرہ آزادی اور انصاف کی جن اقدار کے بل بوتے پر لگایا گیا تھا کیا واقعی پاکستان بننے کے بعد عام لوگوں کو وہ سب اقدار مل سکیں؟ عبداللہ حسین کا یہ ناول چونکہ پاکستان کی سیاسی و سماجی تاریخ کا عمیق منظر نامہ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی ثقافت کی وہ خوشنما اقدار جنھیں مقتدر قوتوں نے اپنی سہولت اور مفاد کے لیے بڑی محنت اور کوششوں سے، سماج میں ایک خاص وضع سے متشکل کیا ہے، جن میں پسماندہ طبقات کو اپنے حالات کے جبر کو

برداشت کرنے اور ان تکلیف دہ حالات میں خوش رہنے کے سبھی گر سکھائے گئے ہیں، ان میں دکھایا جاتا ہے پاکستان بننے کے بعد یہاں کے سفید پوش لوگ جو مقتدر قوتوں کا آلہ کار نہ بنے اور جنھوں نے اپنی سفید پوشی کے بھرم کو عزیز جانا وہ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے پر مزید بدحالی اور ابتری کا شکار ہو گئے۔

پاکستان کی مقتدر قوتوں نے جہاں اس نوزائیدہ مملکت پر اپنا تسلط خوب اچھے طریقے سے مضبوط کیا وہیں نچلے طبقات میں جرائم، سماجی برائیاں اور باہمی استحصال بے لگام ہوتا چلا گیا۔ ناانصافی، اقرباء پروری اور بدعنوانی ایسی عام ہوئی کہ اقتدار کی بڑی کرسیوں پر فائز افسران سے لے کر عام آدمی تک، یہ برائی بڑی تیزی سے منتقل ہوتی چلی گئی۔ حق داروں کا حق مارا گیا اور بے ایمان اور بدعنوان لوگ مختلف محکموں، شعبوں، جگہوں اور اداروں پر قابض ہوتے چلے گئے۔ ناول کے کئی حصے اپنے ادبی متن میں، وہ مناظر دکھانے کو کافی ہیں جب نااہلوں کو اہل کر دیا گیا، قدم قدم پہ رشوت ستانی، بدعنوانی اور سماجی برائیوں کا بازار لگایا گیا اور دانستہ مظلوم لوگوں کا حق تلف کیا گیا۔ ایک نوائیدہ اور لٹے پٹے ملک میں جس کے ہاتھ جو آیا وہ اس کا مالک اور قابض بن بیٹھا۔ رشتوں اور ناطوں کی تقسیم ختم ہو گئی، مفاد پرست لوگ ہر چیز پر قابض ہوتے چلے گئے۔ ناول کے اس حصے میں پاکستان کے ابتدائی عصری حالات کے یہ دردناک مناظر ملاحظہ کیجیے:

"میں تمھیں بتاتا ہوں یہ جو شیخ بنا ہوا ہے یہ سب میراثی اور جولاہے ہیں، کوئی شیخ بن گیا ہے کوئی انصاری۔ آرائیوں کو بھی اب جا کر عزت نصیب ہوئی ہے۔ یہ سبزیاں بیچنے والے ہمارے سامنے زمین پر بیٹھتے تھے۔۔

سیاست کے دو سبق ذہن نشین کر لو۔ پہلا سبق مشہور کہاوت کے مطابق یہ کہ اپنے سارے انڈے ایک ٹوکری میں مت ڈالو۔ مطلب یہ کہ کچھ بھائی، برادری سرکار کے ساتھ رکھو۔ کچھ اپوزیشن کے ساتھ۔ تا کہ جس کسی کا راج ہو، حکومت اپنے ہی ہاتھ میں رہے۔ دوسری بات۔ جہانگیر ہاتھ پھیلا کر انگوٹھا پہلی دو انگلیوں پر ملنے لگا۔۔ پھر ہاتھ پہلو پر لے جا کر کرتے کی جیب کو تھپتھپایا۔۔ پیسہ جناب۔۔ پیسہ۔"(7)

چونکہ نو تاریخیت اس امر پر اصرار کرتی ہے کہ ادبی متون کو تاریخی متون کی مانند سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے، نیز اسے اُن عصری رویوں کی تحدیدات کا تعین کرنے کے لیے بھی پیش نظر رکھا جا سکتا ہے جو تاریخ کے کسی بھی عہد میں سیاسی، سماجی، معاشی یا ثقافتی حوالے سے مقتدر رہے، اسی حوالے سے اگر عبداللہ حسین کے ناول نادار لوگ کے تخلیقی متن میں تہ در تہ پوشیدہ و ملفوف تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں نہ صرف پاکستان کی عصری تاریخ کا وہ منظر نامہ ابھر کر سامنے آتا ہے، جب ملک میں آمریت کا سایہ اس قدر سخت سے مسلط رہا کہ عوام کے لیے اظہار کی سختیوں کی بدولت بات کرنا بھی دوبھر تھا۔ ناول کا تخلیقی متن مارشل لاء کی صعوبتوں کے بیان کے ساتھ ساتھ، عوام کے اس اظہار اور تگ و دو کا بھی عکاس ہے جو وہ جمہوریت کے حق میں اور آمریت کے خلاف مختلف موقعوں پر پیش کرتے رہے۔ ناول کا یہ ادبی متن ایسی جگہوں پر نہ صرف تاریخ کے حقائق کو منظرِ عام پر لاتا ہے بلکہ آمریت کے بیانیوں کے متبادل وہ عوامی بیانیہ بھی پیش کرتا ہے جو اس عہد کے جبر کے متوازی متشکل ہوتا رہا۔

ناول کی کثیر الجہت، وسیع اور وقیع معنویت جہاں مقتدر قوتوں کے جبر و استحصال کے کئی تاریخی مناظر سامنے لاتی ہے وہیں اس ظلم اور ناانصافی کا پردہ بھی فاش کرتی ہے، جسے مقتدر بیانیوں کی صورت، طاقتور اداروں، مقتدر اشرافیہ اور سول و عسکری اجارہ داریوں کے شکنجوں میں، دانستہ اس لیے پھنسایا گیا، تا کہ مفادات محض ان طبقات کے لیے مختص ہو جائیں، جو پاکستان کے اقتدار اور وسائل پر قابض ہیں۔ ناول میں عوام کو جہاں مزاحمت کی علامت دکھایا گیا ہے وہیں ناول کا تخلیقی متن خوف کے اس شبے کا بھی انعکاس ہے جو تب جبر کی صورت ان مظلوم طبقات پر مسلط رہا۔ اس حوالے سے ناول کا وہ حصہ خصوصی طور پر نو تاریخی قرات کا متقاضی ہے جہاں آمریت کے خلاف احتجاج میں، عوام سڑکوں پر باہر نکلنے کو راضی ہیں لیکن ان بندوقوں والوں سے خوف زدہ ہیں، جن کے لیے اپنی طاقت کے زعم میں کسی کی جان، مال، عزت و آبرو کی کوئی وقعت نہیں۔

"عوام تو ہمارے ساتھ ہیں، سڑکوں پر بھی نکل آئے ہیں، مگر یہ نہ بھولیں کہ ملک پر جن کا راج ہے، بندوق ابھی تک ان کے ہاتھ میں ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ہے کہ پچھلے دنوں میں کیا ہوا۔"

"اس وقت حالت یہ ہے کہ اولیول سیٹوں سے کہیں زیادہ داخلے ہو چکے ہیں، کوئی کسی جرنیل کا آ گیا تو کوئی کرنیل کا، کوئی افسر اور کوئی کسی نام نہاد وزیر کا۔ اب تو سچویشن یہ ہے کہ میز کے نیچے گھس کر ہاتھ ماریں تو بھی داخلے کا رستہ نہیں ملتا۔ (8)"

پاکستان کی ابتدائی عصری تاریخ غربت، بدعنوانی، کرپشن، ناانصافی اور اقرباء پروری کی جن سماجی برائیوں کا ابتداء سے شکار رہی، ناول کے متن میں ان تمام کے احوال کا خلاصہ نہ صرف بدرجہ اتم موجود ہے، بلکہ ناول کے بیان میں ان سماجی برائیوں کے اسباب و محرکات، ان کو متشکل کرنے والی قوتیں اور ان سے اپنے ذاتی مفادات کشید کرنے والے طبقات کا احوال بھی، مختلف واقعات کی صورت میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ عبداللہ حسین کے اس ناول کی اہم خوبی اس کا وہ تاریخی تسلسل ہے جو ناول کے مختلف واقعات میں نہ صرف باہمی ربط پیدا کرتا ہے بلکہ پاکستان کی تاریخ کا عہد بہ عہد وہ منظر نامہ متشکل کرتا ہے جو اس عہد کے مورخین بھی ٹھیک سے نہ کر پائے۔

1958 میں پاکستان کی عصری تاریخ میں در آنے والے پہلے مارشل لاء کا احوال، اس کی صعوبتیں اور مسائل، طاقت کا عدم توازن، نئی غیر جمہوری قوتوں کے سیاسی استحکام کی صورت، ناول میں پاکستان کی سیاسی تاریخ کے تمام ادوار بڑی ترتیب اور سلیقے سے یوں مرتب کیے گئے ہیں، جیسے ایک عہد کا ارتقا اور اس کا زوال مختلف حالات واقعات کے تناظر میں نقش کر دیا جائے۔ پاکستان کی تاریخ کے پہلے مارشل لاء نے جہاں غیر جمہوری قوتوں کے لیے پاکستان کی سیاست و اقتدار تک پہنچنے کا راستہ آسان بنایا وہیں ان کے لیے مستقبل کا وہ راستہ کھول دیا تھا، جس کے ذریعے وہ کبھی بھی، ملک میں جمہوریت کے نفاذ کو ترک کر سکیں اور طاقت کے بل پر اپنی غیر جمہوری حکومت کا نفاذ کر سکیں۔

تاریخ کے مختلف متون کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ایک بات جو یقینی نظر آتی ہے وہ پاکستانی سیاست میں در آنے والی پیپلز پارٹی کی وہ جماعت تھی جو اس وقت ملک کی وہ واحد سیاسی جماعت تھی، جسے ذوالفقار علی بھٹو کی سرپرستی اور قیادت میں، وہ شہرت اور پزیرائی ملی، جس کا شاید ہی کوئی تصور کر سکے، اس کی واحد وجہ اس جماعت کا آمریت اور غیر جمہوری طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کا وہ اعتماد تھا، جس نے نہ صرف عوام کو آمریت کے خلاف کھڑے ہونے، ظلم کے خلاف بھرپور احتجاج کرنے کا موقع دیا بلکہ ملک کی استحصال یافتہ، غریب اور مظلوم عوام کو مستقبل میں روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ دے کر وہ خوشنما خواب دکھایا، جس کے تصور سے ہی انھوں نے روشن مستقبل کی ڈھیروں امیدیں وابستہ کر لیں۔

نو تاریخیت کے تصور کو مزید واضح کر دینے والوں میں نمایاں نام فوکو کا ہے، فوکو مقتدر قوتوں کے جس طاقت کے تصور کو پیش کرتا ہے، وہ اسے حاوی و مقتدر بیانیوں کی دین قرار دیتا ہے۔ طاقت کا ارتکاز اور مضبوطی انھی حاوی بیانیوں سے متشکل اور پائدار ہوتی ہے۔ تاہم اگر ایک طاقت کے مدمقابل دوسری طاقت سینہ سپر ہو جائے تو وہ پہلی طاقت کے توازن کو ضرور متاثر کرتی ہے۔ فوکو کے اسی طاقت کے نظریے سے اگر دیکھا جائے پاکستان کی عصری تاریخ اور ملکی سیاست میں پیپلز پارٹی کی آمد ایسی ہی ایک بیرونی قوت کے طور پر ہوئی تھی جو ملک میں داخلی آمریت کے تسلط سے مغلوب ریاست کو اس مقابلے کی دعوت دے رہی تھی جو جمہوری اور غیر جمہوری قوتوں کے درمیان تھا۔ ناول کا یہ متن پاکستان کی تاریخ کے مختلف نشیب و فراز عیاں کرتے ہوئے، تاریخ میں مقتدر قوتوں کی اجارہ داری کا وہ منظر بھی دکھاتا ہے، جب عوام اور جمہوریت کے نام سے تقویت پانے والی پیپلز پارٹی، پاکستان کی سیاست کا اقتدار ایک بار عوام اور جمہوریت کے نام پر حاصل کرتی ہے۔ یہاں ناول کا مرکزی کردار اعجاز پاکستان کی مظلوم لیکن باشعور عوام کی نمائندگی کرتا ہے، جو سیاسی وعدوں پر جلد یقین کرتے ہوئے، مستقبل میں آنے والے وقت کی چاپ سے قطعی بے خبر ہے۔ اس حوالے سے ناول کے متن کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے، جہاں پہلے مارشل لاء سے دوسرے مارشل لاء تک کی تاریخ، اس کی وجوہات اور آنے والے مستقبل کے امکانات متن میں بین السطور موجود ہیں:

"اعجاز نے نئی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اس پارٹی نے غریبوں اور ناداروں کی طرف داری کا نعرہ لگا کر ان کے ضمیر کو بیدار کیا، اور دس برس سے براجمان سابق فوجی صدر کے خلاف تحریک چلا کر اسے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے مطلق العنان حکومت کو ایک فوجی جرنیل کے حوالے کر دیا تھا، جو آزاد الیکشن کرانے کا وعدہ کر چکا تھا۔۔ اس کا اعتقاد تھا کہ پارٹی جو دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک میں پھیل گئی تھی، الیکشن جیت کر حکومت میں آ جائے اور پھر اس کے سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے۔" (9)

سقوطِ مشرقی پاکستان، پاکستان کی تاریخ کا وہ دردناک المیہ اور سانحہ ہے، جس کے ذکر کے بغیر پاکستان کی تاریخ نہ تو بیان کی جاسکتی ہے نہ ہی اس کی درست اور حقیقی تفہیم ممکن ہے۔ تاہم یہ بات بھی اتنی ہی سچ ہے کہ پاکستان کی اس وقت کی تاریخ کے یہ وہ المناک حقائق ہیں، جن سے پردہ ہٹانے کی کوشش مؤرخین نے دانستہ یا مقتدر قوتوں کی منشاء و مرضی کے مطابق، اس لیے بھی نہ کی کہ اس طرح ان اندوہناک حقائق کے منظرِ عام پر آنے سے وہ تمام حقائق، حالات اور واقعات بھی سامنے آجانے کا خدشہ تھا، جن کا براہِ راست تعلق مقتدر قوتوں کے استعماری عزائم اور مشرقی پاکستان میں روا رکھنے جانے والے استحصالی رویے سے تھا۔

عبداللہ حسین کے اس ناول کی نوتاریخی قرات سے جو اہم بات سامنے آتی ہے وہ عبداللہ حسین کا پاکستان کی عصری تاریخ کی جانب وہ پختہ شعور اور حقیقی و منطقی رجحان ہے، جس نے انھیں اس ناول میں پاکستان کے عصری حقائق کے استناد، ان کی بازیافت اور درست افہام و تفہیم، اور پھر ان کی اپنے تخلیقی متن میں بین السطور شمولیت اور تہ در تہ بنت پر قائل کیا اور ناول کے تخلیقی متن کو عصری و سماجی شعور کے حوالے سے، وہ عمیق گہرائی عطا کی جس کا گمان کسی تاریخ متن پر قطعی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ناول جہاں اپنے اندر ماضی، اور ماضی کے کئی تلخ سوالات کو اٹھاتا ہے، وہیں اپنے تخلیقی متن میں مختلف واقعات و مناظر کی شکل میں ان سوالات کے جوابات تک بھی قاری کی راہنمائی کرتا ہے، یوں قاری خود اپنی آنکھوں سے پاکستان کی تاریخ کا وہ حقیقی منظر نامہ دیکھ اور جان پاتا ہے، جسے یہاں کے مقتدر طبقات نے مختلف سانحات کی شکل میں پاکستان کا نصیب بناڈالا۔

ناول میں مشرقی پاکستان کے سانحے کی نوتاریخی قرات جہاں ان اسباب و محرکات کو سامنے لاتی ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا محرک بنے وہیں ان سوالات کو بھی مہمیز دیتی ہے جو اس حادثے کے پس منظر اور پیش منظر میں موجود رہے۔ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ کا معاملہ اس حوالے سے خاصا اہم ہے۔ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو عبداللہ حسین کے اس ناول میں اس رپورٹ کا قضیہ ناول کے اہم موضوعات میں شامل ہے۔ ناول کی تخلیق کے دوران 'سانحہ مشرقی پاکستان اسباب و محرکات' پاکستان کی تاریخ کا ایسا حساس موضوع تھے، جس پر اس عہد کے مؤرخین نے بھی کھل کر نہ لکھا، نہ ہے اس رپورٹ کو منظرِ عام پر لایا گیا جسے جسٹس حمود الرحمان کی سربراہی میں مکمل کیا گیا تھا۔ تاہم عبداللہ حسین جیسے ادیب کی جرات اور بے باکی کی داد دینی چاہیے کہ کہ انھوں نے پاکستان کی عصری تاریخ کے اس اہم موضوع کو نہ صرف اپنے تخلیقی متن میں شامل کیا بلکہ اس پر جو لکھا حق بجانب لکھا۔ ایسی جرات اظہار یقینی طور پر پاکستان کے ان ادباء میں ہی رہی جنھیں پاکستان کا ضمیر کہا جائے تو غلط نہیں۔ عبداللہ حسین کا شمار بھی ان ہی ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد کی آمریت، ظلم اور جبر کے منظر نامے کو اپنے تخلیقی متون میں یوں جذب کرڈالا کہ اس عہد کی ایسی حقیقی تاریخ تشکیل پائی جس کے استناد کو، کسی بھی تاریخی دستاویز کے مدِ مقابل با آسانی رکھا جاسکتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے سانحے سے متعلقہ کمیشن کی وہ رپورٹ جسے مقتدر قوتوں کی ایماء پر مخفی رکھنے، اور عام آدمی کی اس رپورٹ تک رسائی کو مسدود بنانے کے پیچھے یقینی طور پر وہ تلخ سوالات تھے جن کے جوابات اس سے کہیں زیادہ تند تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں سیاسی معاملات اور حصولِ اقدار کی باہمی کُشاکش کے سبب، مشرقی پاکستان میں مقتدر قوتوں کے روا رکھے جانے والے ظلم و جبر کی داستانوں کو جب اس رپورٹ میں شامل کیا گیا، تبھی اس کی رسائی پاکستان کے عام فرد کے لیے ممنوعہ قرار دے دی گئی تھی۔ ناول کا مرکزی کردار جب اس رپورٹ کے مندرجات سب کو پڑھ کر سناتا ہے تو چند ثانیوں کے لیے سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ اعجاز کا یہ سوال اٹھانا کہ پاکستان کے دو ٹکڑے کیوں ہوئے تھے؟ وہ کون سی وجوہات تھیں، جن کی بناء پر پاکستانی فوج کو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال دینے پڑے؟ نیز ان وجوہات کا تعین کرنے کی خاطر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے سمیت، تین اعلیٰ ترین ججوں پر مشتمل ایک کمیشن آف انکوائری ٹیم کی تشکیل، اس کی تفتیش اور تحقیق کے نتیجے کے طور پر کمیشن کا یہ فیصلہ کہ 'یہ محض ایک عسکری شکست نہ تھی، بلکہ ایک عظیم سیاسی اور اخلاقی ہار تھی۔'(10) یہ وہ تلخ حقائق تھے جنھیں پاکستان کی عصری تاریخ کی ترتیب و تدوین میں کبھی شامل ہی نہیں کیا گیا تھا۔ کمیشن کی رپورٹ کے جو حصے ناول میں شامل کیے گئے وہ نہ صرف پاکستان کی المناک سیاسی تاریخ کا کرب اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں بلکہ ماضی کے ان تلخ حقائق کی بازیافت بھی کرتے ہیں، جنھیں مقتدر طبقات نے دانستہ منظرِ عام پر لانے سے گریز کیا۔

> " کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ اخلاقی گراوٹ اس وقت شروع ہوئی جب سینئر افسران 1958 کے مارشل لاء کی انتظامیہ میں ملوث ہوگئے۔ اس صورتحال نے اُس وقت انتہائی صورت اختیار کرلی جب جب مارچ 1971 میں جنرل یحییٰ نے دوسرا مارشل لاء نافذ کیا۔ کمیشن کی رائے میں مشرقی پاکستان کے اندر حالات اس وقت سنگین ہوگئے جب 25 مارچ کو یحییٰ خان نے وہاں ملٹری ایکشن شروع کردیا۔ محمد اشرف۔۔ڈھاکہ کے ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر نے کمیشن کو بیان دیتے ہوئے

کہا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اپنے ہی گھر میں قیدی بنا دیے گئے۔۔۔ ایک گواہ نے کمیشن کو بیان دیا کہ جنرل، اے کے نیازی نے کمانڈر مشرقی پاکستان کا عہدہ سنبھالتے ہی ماتحت فوجیوں سے کہا کہ یہ دشمن کا علاقہ ہے، جو اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ برما میں ہم یہی کیا کرتے تھے۔"(11)

ناول کا یہ بیانیہ اس نام نہاد تاریخ کے تصور کا انہدام کرتے ہوئے جبر کے اس منظر کی تصویر کشی کرتا ہے، جو مشرقی پاکستان میں روا رکھا گیا۔ ناول کا یہ بیان اور متن ہمیں سقوط مشرقی پاکستان کی ان مبالغہ آمیز داستانوں سے دور لے جاتا ہے جنھیں مختلف مؤرخین نے مقتدر طبقات کی منشاء و مفاد کے تحت کچھ یوں مرتب کیا کہ اس سانحے کے اسباب و محرکات سے طاقت کی ان مطلق العنان قوتوں کے جبر کا وہ سایہ چھپ گیا، جس نے مشرقی پاکستان میں ظلم، جبر ناانصافی اور استحصال کا بازار گرم کیا تھا۔ پاکستان کی تاریخ کے نہایت تلخ اور تکلیف دہ حقائق کے منظر عام پر آجانے کا یہی وہ سبب تھا جس کی وجہ سے کمیشن کی اس انتہائی اہم رپورٹ کو خفیہ رکھا گیا اور عام آدمی کی اس تک رسائی کو مسدود کر دیا گیا۔

نو تاریخیت کے مخصوص مطالعہ جاتی طریقہ کار میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ ادیب یا تخلیق کار محض اپنے تخلیقی متن میں گزرے ہوئے وقت کے حالات و واقعات کو مجتمع نہیں کر دیتا بلکہ اپنے عصری، سیاسی و سماجی شعور اور بصیرت سے کام لے کر ان کا تجزیہ کرتا ہے، واقعات کے استناد پر اپنی رائے محفوظ رکھتا ہے اور اسے ناول کے متن میں یوں ڈھالتا ہے کہ قاری اس عہد کی تاریخ، حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ اس تجزیے کا بھی اعادہ کر سکے جو اس ادیب یا تخلیق کار نے عہد بہ عہد سماجی، سیاسی، تہذیبی و معاشرتی عوامل کو سامنے رکھ کر، وقت کی رفتار پر گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ناول کے متن میں عبداللہ حسین کا یہ تجزیہ جسے وہ ناول کے مرکزی کردار اعجازی زبان سے ادا کرواتے ہیں کہ:

"کہا جاتا ہے کہ کمیشن کی رپورٹ کو اگر منظرِ عام پر لا کر اس پر عمل درآمد ہوتا تو فوجی جوانوں کے مورال پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو ایسا سوچتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کیا سچ بولنے سے مورال ڈاؤن ہوتا ہے یا کہ جھوٹ کے پردے ڈالنے سے ایسا ہوتا ہے؟۔۔ سچ بولنے سے تو ساکھ بحال ہوتی ہے۔"(12)

تاریخ کے دیگر ادبی متون کو اگر اس ناول سے متصل کر کے پڑھا جائے تب بھی یہی ایک اجتماعی رائے سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی عصری تاریخ کے وہ حقائق جنھیں پاکستان کی غیر جمہوری قوتوں، عسکری طاقتوں، مقتدر اشرافیہ اور سرپرست طبقات کو بچانے کے لیے منظر عام سے ہٹایا گیا، وہ رویہ قطعاً درست نہ تھا۔ یہ رویہ طاقت کے ان بیانیوں کو تقویت دینے کے مترادف تھا، جو پاکستان کے عام شہری اور جمہوریت کے عام رکن کا اختیار پہلے ہی سلب کر چکے تھے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ جیسے حساس معاملے کو اگر عوام پر اعتماد کر کے ان کے سامنے رکھا جاتا، تو یقینی طور پر یہ ان مقتدر قوتوں کو منظرِ عام پر لانے کے مترادف تھا جو پاکستان کے اقتدار پر بارہا مسلط رہیں اور جن کے ناعاقبت اندیش فیصلوں کے سبب مشرقی پاکستان جدا ہو گیا۔

تاہم یہ بات بھی یہاں پیش نظر رہنے چاہیے کہ طاقت چونکہ ہر کام محض اپنے مفاد کی تقویت کے لیے سر انجام دیتی ہے، اسی لیے کئی حقائق کو دانستہ عوام کی رسائی سے دور رکھا جاتا ہے تاکہ آگہی کی وہ بصیرت جسے حاصل کر کے وہ مقتدر قوتوں پر سوال اٹھائیں، یا ان سے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں، ایسی راہوں کو پہلے ہی مسدود کر دیا جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ کمیشن کی اس رپورٹ کے ساتھ ہوا۔ اسے گمنامی کے اندھیروں میں پہنچانے کی وجوہات یقیناً طاقت کے اسی غالب تصور سے مشروط تھیں۔

خالد حسن جو بھٹو کے کافی قریب رہے، انھوں نے اپنی کتاب مقابل ہے آئینہ میں جب بھٹو کا خاکہ لکھا، تو انھوں نے اس خاکے میں کمیشن کی اس رپورٹ کے بارے میں اپنی یہی رائے قلم بند کی، کہ سانحہ مشرقی پاکستان کے ذمہ داران کو نہ صرف سزا دی جائے بلکہ اس سانحے سے متعلق اس تحقیقی رپورٹ کو بھی منظرِ عام پر لایا جائے، تاکہ عوام کو اس بات کا ادراک ہو سکے کہ تاریخ کے اصل حقائق کیا ہیں۔ اپنی کتاب مقابل ہے آئینہ میں وہ مفاد پرستی کے اس رشتے کی بات کرتے ہیں، جو تب غیر جمہوری قوتوں اور اس وقت کے سیاست دانوں کے مابین باہمی مفاہمت کے حوالے سے طے کیا جا رہا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ:

"جب ہندوستان کی قید سے جنگی قیدیوں کی واپسی کا آغاز ہوا تو بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ایسے افسروں کے خلاف ضرور قانونی کاروائی ہونی چاہیے جنھوں نے مشرقی پاکستان میں تشدد اور لوٹ مار کی وارداتیں کیں، لیکن ایسا کرنے سے گریز یا

گیا۔۔ اور تو اور بھٹو حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ تک شائع نہ کرا سکے۔۔ اس دور کے جرنیل حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے اس لیے بھی خلاف تھے کہ اس طرح وہ عوامی بحث کا موضوع بن جائیں گے۔"(13)

عبد اللہ حسین کے اس ناول میں تاریخ کا دریا یوں روانی سے بہتا چلا جاتا ہے کہ اس میں پاکستان کی تاریخ کے کئی حالات و واقعات ٹھہر نہیں پاتے۔ تاہم واقعات کا یہ تسلسل کہیں کہیں ایسے الجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے جو درحقیقت پاکستان جیسی مملکت میں ظلم، جبر، ناانصافی اور استعماری قوتوں کے اپنی طاقت کے ناجائز استعمال سے متشکل ہوتا ہے۔ عبد اللہ حسین اپنے ناول میں پاکستان کی تاریخ کے اس تلخ دور کو بڑی مہارت سے متن کا حصہ بنا دیتے ہیں جہاں سچ بولنے اور حقائق کو منظرِ عام پر لانے کی سزا، مقتدر قوتوں کی جانب سے جبری گمشدگی، عزت کی پائمالی اور جان کنی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

ناول طاقت اور جبر کے گھیراؤ کو بارہا اپنے متن کا موضوع بنا کر پاکستان کی سیاست، تہذیب، ثقافت و معاشرت میں ان متشدد رویوں کی نشاندہی کرتا ہے، جو مقتدر طبقات کی طرف سے مظلوم عوام پر روا رکھا گیا۔ یقینی طور پر طاقت اور دہشت کی اس نفسیات کے پیچھے وہی سچ چھپا ہوتا ہے جسے مقتدر قوتیں کسی بھی قیمت پر منظرِ عام پر سامنے نہیں لانے دیتیں۔ وہ ہر اُس راستے کو مسدود و محدود کر دینا چاہتی ہیں جو طاقت اور جبر کے استحصال کو عیاں کرے، حقائق کو منظرِ عام پر لائے اور لوگوں کو شعور اور بصیرت کی نعمت سے بہرہ ور کر دے۔

ناول کے مرکزی کردار اعجاز کی جبری گمشدگی، تشدد اور مشرقی پاکستان کے سانحے سے متعلقہ حقائق کو، کمیشن کی رپورٹ سے پڑھ کر مجمعِ عام میں منکشف کر دینے کے عمل کو، جہاں طاقتور استعماری قوتوں کی جانب سے ناپسند کیا جاتا ہے، وہیں اس پر اعجاز کی جبری گمشدگی اور تشدد کی صورت، ایسا ردِ عمل ظاہر کیا جاتا ہے جس کا مقصد اسے مستقبل میں حقائق کی بازیافت جیسے کسی بھی کام سے باز رکھنا ہوتا ہے۔ تاہم جبری گمشدگی اور طاقت کے ناجائز استعمال کا یہ وہ مجرمانہ فعل ہے جسے مقتدر قوتوں کی جانب سے پاکستان کے ان باشندوں پر روا رکھا جاتا ہے جو حق گوئی کی جسارت کریں۔ ناول کا یہ منظر اس حوالے سے نہایت دردناک ہے، جہاں اعجاز کو مشرقی پاکستان سے متعلقہ کمیشن کے حقائق کو منظرِ عام پر لانے پر نہ صرف جبری طور پر گمشدہ کر دیا جاتا ہے بلکہ اسے خوب تکلیف و اذیت میں بھی رکھا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ناول کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

"میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہیں۔ میں نے کہا مجھے علم نہیں کہ میں کہاں پر ہوں اور کس عقوبت خانے میں بند ہوں۔ ہر طرف تالے لگے ہیں، میں یہاں سے بھاگ کر کہاں اور کیسے جا سکتا ہوں؟ کیا آپ لوگ میرے ہاتھوں کو کھول نہیں سکتے؟ کم از کم ہاتھوں کو آگے لا کر ہی ہتھکڑی لگا دیں۔ میرے کندھوں میں درد سے ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔"(14)

چونکہ نئی تاریخیت کسی بندھے ٹکے رشتے، تصور یا نظریے کا نام نہیں، اسی لیے یہ ادب، ثقافت اور تاریخ کے پیچیدہ رشتوں کی گرہ کھولتے ہوئے، متن میں مضمر، مستور اور تہ در تہ موجود، تاریخ کے حقائق کی بازیافت کا نام ہے۔ اسی لیے ناول 'نادار لوگ' کے تخلیقی متن میں، قصہ در قصہ واقعات کی گرہ کھولی جائے تو کچھ واقعات کا براہِ راست تعلق پاکستان کی عصری تاریخ کے ان تلخ حقائق سے جا ملتا ہے، جن پر نہ صرف عصری مؤرخین نے کم لکھا، بلکہ دانستہ انھیں مقتدر قوتوں کی مرضی و منشاء کی بدولت تاریخ سے نظر انداز کرنے کی سعی بھی کی۔ ناول کا ایک اور مرکزی کردار کیپٹن سرفراز جو مشرقی پاکستان میں ہونے والے جنگ کے واقعات کو اپنی نظر سے دیکھ چکا ہے اور ان سانحات کی سنگینی کو اپنے دل پر محسوس کر چکا ہے، جب وہ مشرقی پاکستان سے وطن واپس آتا ہے تو اس کے لیے کئی چیزوں کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ ناول کا وہ حصہ جب کیپٹن سرفراز کو بلوچستان میں بغاوت کو روکنے کے لیے بھیجا جاتا ہے، تب اس کے لیے ایک بار پھر مشرقی پاکستان کے سانحے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ناول میں تاریخ کا تسلسل جب تیسرے مارشل لاء کا احاطہ کرتا ہے تو تاریخ کے ان تلخ حقائق اور واقعات کا بھی اعادہ کرتا ہے، جو بلوچستان میں اٹھنے والی قبائلی بغاوت پر فوج کشی سے مشروط تھے۔ نھیں ریاست کی جانب سے کسی بھی مذاکراتی میز پر بیٹھ کر حل کیا جا سکتا تھا۔ ناول میں جب 'آپریشن ماؤنٹین گوٹ' کے نام سے کی جانے والی کاروائی کو، فوجی ہیلی کاپٹروں اور مشین گنوں سے طے کیا گیا، تب ناول کے وہ حصے خاص طور پر تکلیف دہ ہو جاتے ہیں جب 'کوبرا گن شپ' کی مدد سے بلوچ قبائل کے قدیم طرز کے خستہ مکانوں پر گولیاں برساتے ہوئے ریاستی انٹیلی جنس کی وہ اطلاعات قطعاً غلط ثابت ہو گئیں کہ 'پراریوں کے پاس بزوکا ٹائپ گن یا کسی بڑی توپ کا ہونا ممکن تھا۔'(15)

اسی طرح سے ناول کا وہ حصہ جب فوج کا مقابلے کرنے والے قبیلے کے لنگڑے سردار کو پستول داغنے اور پھر پھینکنے کے باوجود شوٹ کر دیا جاتا ہے، طاقت اور جبر کے اس استحصالی بیانیے کو منظرِ عام پر لاتا ہے، جس میں طاقت نہ تو کمزور کے کسی دفاعی بیان کو سننے کی اہل ہے اور نہ ہی مذاکرات کی کوئی راہ نکالنے کی خواہش مند۔ وہ ہر فیصلہ طاقت اور جبر کے اندھے قانون سے کرنا چاہتی ہے۔ ناول کا وہ حصہ ظلم واستعمار کے اس جبر کو سمجھنے میں خصوصی معاون ہے، جب بوڑھا سردار جو معذور ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم ہتھیاروں سے لیس ہے، اس کو شوٹ کر دینے سے کیپٹن سرفراز کے ذہن میں مشرقی پاکستان کے حالات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جب وہ ناراضگی میں اپنے افسر سے کہتا ہے کہ اس بوڑھے کو شوٹ کرنا قطعاً غیر ضروری تھا، تب افسر کا جواب بھی اس کے جنون کو روک نہیں پاتا:

"ڈی مورلائیز کرنے کے لیے یہ ٹیکٹ ضروری تھا، حیرت ہے سرفراز کہ تم ایسی بات کر رہے ہو جو ابتدائی مینوئلز میں پڑھائی جاتی ہے'۔۔ جب اس کی آنکھوں کی روشنی لوٹ کر آئی تو کرنل اسلام الدین کرسی پر پڑا تھا اور سرفراز اُس کے اوپر جھکا گریبان سے جھنجھوڑ رہا تھا، 'تم اپنے ہی آدمیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو؟' سرفراز نے اپنے آپ کو چیخ کر بولتے سنا۔"(16)

ناول کا متن جہاں حق اور سچ کا فیصلہ قاری پر چھوڑتا ہے وہیں تاریخ کے اس گرداب کو بڑے زور و شور سے گھومتے دکھاتا ہے جو اپنے اندر کئی زمانوں کی تاریخ کا کرب سموئے ہوئے ہے۔ کیپٹن سرفراز کو حق اور سچ بولنے کے جرم میں غدار کہا جاتا ہے اور آخر کار اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ اس کا بڑا بھائی اعجاز جو پہلے ہی حق اور سچ بولنے کی کافی سزا بھگت چکا ہے، یہ دونوں کردار تاریخ کے اس عظیم بہاؤ کا حصہ بن جاتے ہیں جو ازل سے جاری و ساری ہے۔

عبداللہ حسین ناول کے اختتام کو بڑی مہارت سے جبر کے اسی دائرے میں واپس لے جاتے ہیں، جو ابتداء سے جاری و ساری ہے۔ جس کا تعلق تہذیب و ثقافت کی ان جڑوں سے ہے جو سماج میں مخصوص صورتوں میں سرایت کیے ہوئے ہیں، جہاں جبر، مظلوم لوگوں کو اپنی زندگی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ جسے مقتدر طبقات نے محض اپنی مفاد پرستی کے لیے، اس مخصوص قسم کی ذہن سازی سے یوں متشکل کیا ہے کہ سماج کا ہر فرد اس جبر پر تکلیف میں ہونے کے باوجود مہر بہ لب ہے۔

چونکہ تاریخ کے مخصوص تصور میں ان مقتدر بیانیوں کے ساتھ ساتھ ان مظلوم اور استحصال یافتہ طبقات کا ہونا بھی شامل ہے جن کی مزاحمت ہمیشہ انھیں مؤرخین کے نزدیک تاریخ کے حاشیے سے باہر کھڑا کر دیتی ہے اور جبر کے ان دائرں میں دھکیل دیتی ہے، جن سے نکلنے کی کوشش میں وہ عمر بھر سرگرداں رہتے ہیں۔ عبداللہ حسین کے ناول کا تسلسل بھی جبر کے ان ہی دائروں میں جاری رہتا ہے۔ کہانی کی ابتداء میں شروع ہونے والا بھٹے کے مزدوروں کا قصہ، اور ان پر جاری جبر کی داستاں اب بھی جاری ہے، اور کہانی کے سب کردار اس دائرے میں یوں مقید و محصور ہیں، جیسے اس جبر کے وہ صدیوں سے عادی ہیں۔

"آخر جب پیر صاحب نے بھٹے کو قتل کے برے اثرات سے پاک قرار دے دیا تو اگلے ہی روز دوسرے بھائیوں کی نگرانی میں بھٹے کا کام زور و شور سے شروع ہو گیا۔ اب نقصان پورا کرنے کو بارہ کی بجائے سولہ گھنٹے کام کی شفٹ۔۔ مقرر کر دی گئی۔۔۔ مفت چاول کھانے سے ان کے چہرے پر جو تازگی آئی تھی اُسی سرعت سے غائب ہو چکی تھی۔ ان کے بدنوں پر قدیم عسرت کے نشان ایک لیبل کی مانند دوبارہ چسپاں ہو گئے۔"(17)

درج بالا اقتباس تاریخ کا وہ حقیقی جبر ہے جو پاکستان کے استحصال یافتہ، غریب، مظلوم اور نادار طبقات کے ساتھ ابتداء سے جاری و ساری ہے۔ جہاں اشرافیہ اور مقتدر طبقات، کئی طریقوں سے مظلوم کا استحصال کرتے ہیں۔ یہاں افسردہ حقیقت یہی رہ جاتی ہے کہ معاشرے کا سب سے زیادہ پسنے والا یہ استحصال یافتہ طبقہ، اپنی جبری حالت کو فطری جانتے ہوئے، اپنی زندگی جیے جاتا ہے اور مقتدر بیانیے، ان کی ذہن سازی کے نت نئے طریقے خلق کیے جاتے ہیں۔

نو تاریخیت کے ادب، تاریخ اور ثقافت کے مربوط رشتے کے پیشِ نظر، ادبی متن اور ان کے متعلقہ عہد کے سماجی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی مطالعہ جات اور تفہیم کی بدولت، جہاں اکثر ادبی متون کی بنیاد میں تاریخ کے کسی مخصوص عہد کے جبر کی بازیافت ممکن ہے، وہیں تاریخ کے ان حقائق کے استناد تک بھی رسائی آسان ہو جاتی ہے، جو کسی خاص عہد کو اپنے خاص اثر و رسوخ سے متاثر کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ عبداللہ حسین کا یہ ناول جہاں فکر و فن کی کئی خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے وہیں پاکستان کی عہد بہ عہد کئی عشروں پر

مشتمل تاریخ کا، ایسا غیر جانبدار اور متبادل بیانیہ بھی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، جو کسی بھی تاریخی دستاویز سے کم نہیں۔ یہ متبادل بیانیہ پاکستان کی موجودہ عصری صورتحال اور مسائل کی ان وجوہات کا بھی تعین کرتا ہے جن کی جڑیں آج بھی ماضی میں کہیں پیوست ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ ناول پاکستان کی عصری تاریخ کا حقیقی آئینہ ہوتے ہوئے، ہمارے ان مسائل کی بھی نشاندہی کرتا ہے جو پاکستان کے قیام سے آج تک بعینہ وہیں موجود ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

1. Stephen Greenblatt, 'Towards a Poetic of Culture', from 'New Historicism' edited by H.Aram Veeser', Routledge Taylor and Francis Group London and NewYork, 2013.(Pg: 12)

2. ibid (Pg:11)

3. Michel Focult, 'Archaeology of Knowledge', Paris 1989.(Pg: 12)

4۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، 'جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)'، انجمن ترقی اردو، پاکستان، 2013 (ص۔254)

5۔ روش ندیم، ڈاکٹر، 'عبد اللہ حسین: عام لوگوں کا مؤرخ ادیب' مشمولہ 'عبد اللہ حسین - ایک مطالعہ' مرتب: ڈاکٹر سید عامر سہیل، بیکن بکس ملتان۔ جنوری 2016 (ص۔184)

6۔ عبد اللہ حسین، 'نادار لوگ'، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ 2014 (ص۔151)

7۔ ایضاً (ص۔171)

8۔ ایضاً (ص۔366)

9۔ ایضاً (ص۔377)

10۔ ایضاً (ص۔737)

11۔ ایضاً (ص۔738)

12۔ ایضاً (ص۔740)

13۔ خالد حسن، 'مقابل ہے آئینہ'، مترجم راجہ انور، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، 2005۔ (ص۔18)

14۔ عبد اللہ حسین، 'نادار لوگ'، (ص۔754)

15۔ ایضاً (ص۔772)

16۔ ایضاً(ص۔779)

17۔ ایضاً(ص۔804)